"جہاں نما میں ادب، ثقافت اور جمہوریت"

Literature, Culture and Democracy in 'Jehan Numa'

تزئین گل، سعدیہ خلیل

Abstract

Dr. Zahoor Ahmad Awan is a well-known writer of Khyber Pakhtunkhwa, who had worked on many genre of literature that included travelogue, Biographies, sketch writing, translations and reportage etc. In this article one amongst his reportage "Jehan Numa" will be precisely and critically analyzed to represent the literature, culture and democratic aspects.

ادب اظہار ذات کا وسیلہ ہونے کے ساتھ اُس عہد کی معاشرتی ضروریات اور فکری میلانات کا عکاس بھی ہوتا ہے۔ فنکار اپنے خیالات، جذبات اور تاثرات کا مناسب اور موثر انداز میں اظہار کرنے کے لئے کسی خاص صنف کا انتخاب کرتا ہے اور یوں ادب کی مختلف اصناف کا دامن وسیع و کشادہ ہوتا ہے اور اس میں گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ رپورتاژ اُن چند اصناف میں سے ہے جس کی ابتداء بیسوی صدی کے وسط میں ہوئی لیکن اس نے بہت جلد ترقی کی منازل طے کیں۔ رپوتاژ وہ نثری تحریر ہے جس میں سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی و علمی تقریب یا کسی واقعے کا آنکھوں دیکھا حال صداقت اور واقعیت سے ادبی پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔ اِس میں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگرچہ اس کا پہلے سے طے شدہ کوئی پلاٹ نہیں ہوتا لیکن اس میں کہانی، کردار، مکالمہ اور منظر کشی موجود ہوتی ہے۔ اس میں بیک وقت سفر نامہ، ناول، افسانہ، آپ بیتی، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری اور صحافت کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ اس میں شعور کی رو، فلش بیک اور تلازمات کا استعمال بھی کیا جاتا ہے لیکن واقعات کی زمانی ترتیب قائم رہتی ہے۔ عام طور پر اس میں کانفرنس کی رپورٹ، جنگی و سیاسی حالات و واقعات اور فسادات و انقلابات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا جاتا ہے۔

قمر رئیس رپورتاژ کے نقوش واضح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

> "رپورتاژ میں ادیب گزرے ہوئے واقعات کو اپنی ذات کے رشتے سے اس طرح از سر نو ترتیب دیتا ہے کہ قارئین اس جیتی جاگتی متحرک فضا میں کھو جاتے ہیں۔ اس کی دستاویزی حیثیت بھی رہتی ہے۔ افسانوی اور تخلیقی بھی اور حقیقی واقعات کو جذبہ کی دھیمی دھیمی آنچ پر مشاہدہ کی باریکی اور تخیل کی نازک شعاعوں کے لمسو سے ایسے حسین پیکر میں ڈھالتا ہے جو دائمی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔"(۱)

رپورتاژ کے خدو خال جان لینے کے بعد جب ہم خیبر کے پی کے پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں ایک اہم نام ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کا نظر آتا ہے جن کی دو اہم رپورتاژیں "دھوپ، چاندنی اور ہوا" اور "جہاں نما" ہیں۔ اولذکر ساتویں اہلِ قلم کانفرنس کی روداد ہے جبکہ مؤالذکر عالمی ادیبوں اور دانشوروں کی کانفرنس منعقدہ ۳۰نومبر تا ۳ دسمبر ۱۹۹۵ء کی تفصیلی روداد ہے۔ اس کانفرنس میں جہاں مختلف سیشن ہوئے وہیں مندوبین کو مختلف مقامات کی سیر کرائی گئی اور ان کے اعزاز میں مختلف تقاریب اور ضیافتوں کا اہتمام بھی کیا گیا۔ ان تمام کی تفصیلات اس رپورتاژ کا حصہ ہیں۔ اس مقالے میں "جہاں نما" کا ادبی اور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

"جہاں نما" کا زیرِ نظر ایڈیشن فروری ۱۹۹۴ء میں ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور نے شائع کیا اور اس کتاب کے صفحات کی تعداد تقریباً ۲۰۸ ہے۔ مصنف نے "عرض مصنف" کے زیرِ عنوان کانفرنس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کانفرنس میں تقریباً چار سو غیر ملکی اور تین سو سے زائد ملکی ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی۔ اس کانفرس کی ساری کاروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔ چالیس کے قریب مقالات انگریزی زبان میں پیش کئے گئے اور جو نہ پیش کیے جا سکے وہ بھی انگریزی زبان میں تھے۔ مصنف نے کانفرنس میں پیش کئے گئے مقالات کا ترجمہ بامحاورہ اُردو زبان میں کیا ہے تاکہ ایک عام قاری بھی دیگر ممالک کے دانشوروں اور ادباء کے خیالات سے آگاہی حاصل کر سکے۔

اس کانفرنس کا موضوع "ادب، ثقافت اور جمہوریت" تھا۔ مصنف نے اس کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس رپورتاژ کا نام "جہاں نما" منتخب کیا۔ یہ رپورتاژ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مذکورہ موضوع پر تمام دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کے خیالات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کانفرنس میں دنیا کے متعدد ممالک کے مندوبین نے شرکت کی جن میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، جرمنی، رومانیہ، سویڈن، بلجیم، یونان، آسٹریلیا، چین، مصر، ارجنٹینا، کوسٹاریکا، چیک ری پبلک، یوراگوئے، الجیریا، الجزائر، ایران، بنگلہ دیش، کینیا، سینگال، لبنان، زمبابوے، زامبیا، یوگینڈا، عراق، کویت، بوسنیا، نیپال، ویت نام، کرغستان، تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اس رپورتاژ میں رپورٹنگ اور صحافت کا عنصر موجود ہے۔ مصنف نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کانفرنس کا انعقاد کس طرح ہوا۔ اس میں واقعات کسی ترتیب سے پیش آئے، مختلف سیشن میں مقالات کن کن دانشوروں نے پیش کئے اور ان کے مقالات کے اہم نکات کیا تھے۔ مصنف نے ان میں سے اہم تقاریر کا انتخاب کرتے ہوئے اُن کے تراجم تحریر کر دیئے ہیں۔ ابتداء ہی میں بتاتے ہیں کہ احمد ندیم قاسمی نے مذکورہ موضوع پر اُردو میں اپنا مقالہ پیش کیا اور جمہوریت کے لئے اس امید کا اظہار کیا کہ وہ دن بہت خوبصورت ہو گا جب ہماری قوم کے ہر طبقے کو قومی اسمبلی میں نمائندگی حاصل ہو گی اور اس دن کے لانے کے لئے ہمیں عدم رواداری، تعصبات اور بے صبری کو چھوڑ کر دوسروں کے نکتۂ نظر کو سننے اور قبول کرنے کا جمہوری کلچر اپنانا ہو گا تب ہی یہ دن دیکھنا نصیب ہو سکے گا۔(۲)

دوسری جگہ ڈاکٹر لارنس زیرین کے مقالے میں ثقافت اور جدیدیت کے حوالے سے وں تحریر کرتے ہیں کہ ثقافت ایک مخصوص گروہ کے جذبات، تعصبات اور داخلی جذبات کا علامتی اظہار ہوتی ہے۔ یہ علاقے، زمانے اور جغرافیہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ کچھ معاشرے جدیدیت کو بے تعصبی سے جلد قبول کر لیتے ہیں جبکہ پابند روایتی معاشرے اِسے اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ انھیں اپنی تہذیبی اقدار کے منتشر ہو جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے اور اس رویے کا تعلق خارجی حالات سے زیادہ ذہنی و داخلی کیفیات سے ہوتا ہے۔(۳)

ایک مقام پر برطانیہ کی آرٹسٹ محترمہ پروکچنگ کے مقالے "ثقافت اور ترقی کامیاب یا بے جوڑ شادی" کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میری نگاہ میں یہ یورپ کی بد قسمتی ہے۔ کلچر محض زبان، لباس، سماجی رویوں اور جزوحیات کا نام نہیں بلکہ یہ بغیر کسی تقسیم و تفریق کے کلیت حیات کا نام ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تصورِ ثقافت کو کھو کر یورپ خود زبوں ہو گیا ہے۔ نام نہاد ترقی یافتہ معاشرے میں تخلیقی صلاحیتوں کو زراندوزی کے کمالات سے کم تر قرار دے کر یورپ اپنی ثقافتی افلاس کا اظہار کر رہا ہے جو بے خبر معاشرے یورپ کی اس روش کی تقلید میں مصروف ہو کر اپنی ثقافت کا گلا گھونٹ رہے ہیں وہ در حقیقت نہلانے کے بعد پانی کے ساتھ بچے کو بھی باہر پھینک رہے ہیں"۔(۴)

یہ اور ایسے کئی مقالات جن میں ادب کے ساتھ ثقافت اور جمہوریت کا رشتہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس رپورتاژ میں موجود ہیں جو قاری کو مشرقی اور مغربی دنیا کے دانشوروں کے خیالات اور نظریات سے متعارف کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔ ان دقیق، فصیح، بلیغ اور پر مغز مقالات کے تفصیلات کے ساتھ کئی دلچسپ واقعات بھی موجود ہیں جہاں حریف ممالک کے ادیبوں اور دانشوروں کی ایک دوسرے سے نوک جھونک کو بیان کیا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک صورتِ حال کویت اور عراق کے ادیبوں کے درمیان پیش آئی۔ ایک دلچسپ صورتِ حال اُس وقت دیکھنے کو ملی جب بنگلہ دیش کی ادیبہ ڈاکٹر سلطانہ ثروت نے پاکستان کے ادیبوں اور عوام الناس پر الزام لگایا کہ جب مشرقی پاکستان میں آگ و خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی اور بنگلہ دیشی عوام اور دانشوروں کا فوجی حکومت قتلِ عام کر رہی تھی تو پاکستانی عوام اور دانشوروں نے اس کی کوئی مذمت نہیں کی اب میں ان سے مطالبہ کرتی ہوں کہ وہ سرکاری طور پر بنگلہ دیش کی عوام سے معافی مانگیں۔ اس موقع پر ہال میں سناٹا طاری ہو گیا۔ لیکن جلد ہی پاکستانی دانشور اور صحافی مظہر علی کی اہلیہ محترمہ طاہرہ مظہر علی نے جو حقوق و بہبود نسواں کی سیاسی اور سماجی کارکن ہیں انھوں نے آکر کہا کہ بنگلہ دیش کے بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ جو ظلم ہوا پاکستانی عوام کا اُس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا اور ہم سب کو بھی اس کا دکھ ہے۔ اس لئے وہ دو سال پہلے بنگلہ دیش میں جا

کر وہاں کے عوام سے معافی مانگ چکی ہیں۔ آج پھر پاکستانی عوام کی طرف سے معافی مانگتی ہیں۔ اس پر صورتِ حال میں بہتری آتی ہے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مصنف نے مقالات کے تراجم کے ساتھ ساتھ اس کانفرنس میں پیش کی گئی منظومات کے تراجم بھی آزاد نظم کی صورت میں کیے ہیں۔ وہ اپنی اس صلاحیت کا اظہار اعجاز رحیم صاحب کے دو انگریزی مجموعہ کلام کے اردو تراجم "خواب گر کھلونا" اور "گرفتار ہوا" کے زیرِ عنوان کر چکے ہیں۔

اس رپورتاژ میں بھی کئی نظموں کے تراجم آزاد نظموں کی صورت میں موجود ہیں جن میں سے ایک کویتی شاعر سلیمان عانی کی ایک نظم کا ہے جو انھوں نے عراقی جارحیت کے خلاف لکھی۔ وہ کہتے ہیں:

"تاریک اگست کی دو تاریخ کو

میرا سورج بجھا دیا تند ہواؤں نے

میرے درختوں کے سویرے (سائے) گم ہو گئے

میرے دروازے پر ماں کی دستک چپ ہو گئی

میرا ریڈیو چنگاڑ اُٹھا

اُٹھو وطن کے لوگو

کہ آگ لگ گئی ہے

وطن تمھیں بُلا رہا ہے"(۵)

"جہاں نما" میں سفر کا عنصر بھی موجود ہے۔ مصنف فوکر طیارے کے ذریعے اسلام آباد پہنچے اور کانفرنس کے دوران بھی ٹیکسلا اور خان پور ڈیم گئے اور واپسی پر بذریعہ سڑک واپس آئے۔ مصنف نے سفر کے دوران فطرت کے حسین مناظر کی دلکش منظر کسی کی ہے۔ چنانچہ فوکر طیارے میں سفر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یہ چونکہ کم بلندی پر پرواز کرتا ہے اس لئے زمین کے مناظر صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ بڑے بڑے گھر مٹی کے گھروندے لگتے ہیں، دریا پانی کی لکیریں اور سڑکیں سیاہ دھاگے جیسی نظر آتی ہیں۔ یوں آبادیوں میں گاؤں، شہر، مسجد اور کھیت کھلیاں چھوٹے ہو کر مزید خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔(۶)

قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ مصنف نے مندوبین کے اعزاز میں دی گئی تقریبات ضیافتوں کی خوبصورت منظر کشی کی ہے جو مختلف وزراء اور اداروں نے مہمانوں کے اعزاز میں منعقد کیں۔ ان میں دعوت طعام اور محفلِ موسیقی خصوصی اہمیت کی حامل

تھیں۔ ایک محفل اسلام آباد کے پرل کانٹی نینٹل میں آراستہ کی گئی۔ وسیع سبزہ زار میں پنڈال لگایا گیا جہاں اسٹیج پر فنکاروں اور گلو کاروں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تو دوسری طرف پنڈال کے درمیان میں آگ کا الاؤ روشن کیا گیا جس کے گرد مہمان کرسیوں پر بیٹھے آگ اور موسیقی کی گرمی سے لطف اندوز ہوتے رہے، تیسری طرف مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے انواع واقسام کی نعمتیں چن دی گئیں تھیں جن میں حلوہ پوری، چپلی کباب، سیخ کباب، پلاؤ، زردہ، سری پائے کے مٹکے، ساگ دال، مرغ چھولے کے مٹکورے، دہی کے کونڈے، کھیر کی ٹھوٹھیاں، شاہی ٹکڑے، مرغی، تندوری روٹیاں اور طرح طرح کے پھل وغیرہ وغیرہ رکھے تھے۔ گویا ثقافتی کھانوں کا مینا بازار سجا دیا گیا تھا۔ یوں موسیقی کی تان، آگ کے شعلوں اور پھیلتے ہوئے دھوئیں اور کھانوں کی خوشبوؤں نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔(۷)

ایک تقریب یاسمین باغ میں عشائیہ کی تھی جس کا اہتمام سی۔ ڈی۔ اے اسلام آباد نے کیا۔ اس موقع پر قیامت خیز سردی کو منقلوں اور ہیٹروں سے کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ محفل موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں نیم کلاسیکی اور عوامی موسیقی دونوں شامل تھیں۔ یہاں عوامی اور لوک موسیقی، نیم کلاسیکی موسیقی پر غالب رہی۔ راگ اور راگنیوں پر ڈھول کی تاپ سر چڑھ کر بولی۔ کھانے کے بعد ڈھول فرمائشی طور پر بجوایا گیا اور اُس کا نشہ ہر علاقے اور خطے کے باشندوں کے سر چڑھ کر بولا۔ چنانچہ فخر زمان، جام ساقی، طاہرہ مظہر علی، گل جی، عبد اللہ حسین، منیر نیازی، برطانوی میمیں، امریکی دانشور، ازبک لیڈیاں، کوہِ قاف کے باشندے اور منگول چہرے سب ہی بے اختیار رقصاں ہوگئے۔ مصنف کلاسیکی اور لوک موسیقی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "دھمال اور ڈھول کی موسیقی عوام کی موسیقی ہے۔ ستار اور طبلے کی آراستہ اور سریلی موسیقی دربار کی موسیقی ہے۔ یہاں عوامی موسیقی جیت گئی۔ ادیب اور شاعر کتنے نک چڑھے Sophisticated کیوں نہ ہوں اندر سے عوام الناس ہی ہوتے ہیں۔ عوام کا کلچر کھردرا Crude مگر مقبول و متحرک ہوتا ہے۔ یہ نیند سے بیدار کرتا ہے۔ اشرافیہ کا اسلوب موسیقی آنکھیں بند کرنے اور دور خلاؤں میں لے جانے کا سامان کرتا ہے۔ موسیقی کے اسالیب کی یہ بالائی وزیریں آویزش جاری ہے جاری رہے گی"۔(۸)

مصنف نے اس رپور تاژ میں جسمانی سفر کے ساتھ ذہنی سفر بھی کیا ہے۔ وہ حال میں رہتے ہوئے کبھی ماضی میں لوٹ جاتے ہیں اور کبھی پاکستانی عوام کے مستقبل کو تلاش کرنے مستقبل کا رُخ کرتے ہیں۔ لیکن لوٹ کر حال ہی میں واپس آتے ہیں۔ پشاور ائیر پورٹ پر بیٹھے بیٹھے انہیں اپنے امریکہ کے قیام کا زمانہ یاد آجاتا ہے اور وہ امریکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہوائی اڈے کے لاؤنج میں بیٹھے اپنے استاد سے ملنے کے بعد انہیں اپنا میٹرک کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ اسلام آباد کی سڑکوں پر گھومتے گھومتے وہ وہاں کے اعلیٰ طبقے اور عوام الناس کی زندگی کے تضادات پر غور کرنے لگتے ہیں اور اسی طرح پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھنے کے بعد اُس کی زندگی کے مسائل اور حالات میں الجھ جاتے ہیں۔ ایک جگہ کانفرنس کے دوران زامبیا کے ڈاکٹر کسوما کے بیان پر کہ امریکہ کا معاملہ

دوسرے براعظموں سے یوں مختلف ہے کہ بظاہر امریکہ میں نو آبادیاتی نظام ختم ہو چکا ہے مگر در حقیقت کلچرل ٹرانسفر آف پاور ابھی تک نہیں ہوا۔ یہ سن کر مصنف سوچنے لگتے ہیں کہ ایشیاء اور خصوصاً تیسری دنیا کے اکثر ممالک ٹرانسفر آف پاور کے باوجود معاشی اور ثقافتی طور پر ابھی تک نو آبادیاتی آقاؤں کے زیرِ اثر ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"بلکہ ریموٹ کنٹرول کے ذریعے یہ اثر بڑھ گیا ہے، پتلون ٹائی، چھری کانٹے کا کلچر گیا نہیں تھا کہ جین جیکٹ، برگر، مائیکل جیکسن، ہیپی، پاپ میوزک کی صورت میں بڑے دھماکے کی صورت میں واپس آ گیا ہے"۔(۹)

یوں اس رپورتاژ میں داخلیت اور خارجیت کے حسین مرقعے موجود ہیں۔ رپورتاژ کے لئے ایک اہم عنصر حقیقت نگاری بھی ہے۔ چونکہ اس کے حالات، واقعات اور کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس میں واقعیت نگاری کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ ظہور احمد اعوان صاحب نے معاشرے اور سماج کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور وہ ایک حساس اور درد مند دل رکھنے والے فنکار ہیں۔ اسی لئے اس رپورتاژ میں حقیقت نگاری بھی موجود ہے لیکن چونکہ مصنف ترقی پسند خیالات کے مالک ہیں اسی لئے اُن کے فکر و فن پر ترقی پسند خیالات حاوی ہیں۔ وہ پاکستان کے طبقاتی نظام کے خلاف ہیں۔ اسی لئے ملک میں دوغلے معاشی اور معاشرتی نظام پر جگہ جگہ بات کرتے ہیں۔ وہ اس پر بھی نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ایک طرف اس کانفرنس کے انعقاد پر لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کئے گئے تو دوسری طرف اس سے عوام الناس کو کوئی فائدہ حاصل نہ ہو سکا۔ ایک طرف اگر یہ مہمان "مرغ وماہی" مارتے ہیں تو دوسری طرف غریب عوام کے بچے اُن کا بچا ہوا کھانا سمیٹنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرتے ہیں اور انہیں للچائی ہوئی اور پر ہوس نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ایک طرف اگر اسلام آباد کی چمکدار سڑکیں ہیں جن پر نئی سے نئی گاڑیاں دوڑتی پھرتی ہیں اور محلات نما مکانات ہیں تو دوسری طرف ایک چھوٹی سی بچی رات کے وقت پھول بیچ کر اپنے گھر والوں کا پیٹ پالتی ہے۔ یوں انہوں نے پاکستان کی دورخی تصویر بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"جہاز بہت نیچے آیا تو چراغاں والے گھروں کے ساتھ ایک بتی والے گھر بھی نظر آنے لگتے تھے۔ دراصل یہ ایک بتی والے گھر ہی سچے پاکستانیوں کے گھر ہیں۔ سیدھے سادھے مخلص، دیانت دار، محنتی مزدور کسان، زمین کا سینہ چیر کر اناج اُگانے اور کارخانوں کی بھٹیوں کے سامنے سینہ کھول کر کھڑے ہونے والے بہادر انسان۔ ان کے معصوم بچے پاکیزہ بیبیاں یہ سب اچھے لوگ ہماری دھرتی کا سنگھار ہیں۔ ہم ان کے پروں پر اُڑتے ہیں یہ اوپر نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ ہم ان کے سینے پر مونگ دلتے ہیں یہ مونگ دلوا کر بھی خوش رہتے ہیں۔ ہم مونگ دل کر بھی ہر وقت نالاں و پریشاں و ہراساں دکھائی دیتے ہیں " (۱۰)

فن کار کا سارا فن اسی میں پوشیدہ ہوتا ہے کہ وہ مقصد کو فن پر حاوی نہ ہونے دے۔ اکثر ترقی پسند ادیب اسی لئے ناکام رہے کہ ان کے ہاں فن پر مقصدیت غالب آ گئی۔ اس رپورتاژ میں بھی مصنف ایک مقام پر جذباتی ہوئے ہیں جب وہ غریب بچوں کا

ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بچے جن کا مستقبل اور خوشیاں ہم نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں یہ ہمارے تنے ہوئے پیٹوں کا حال نہیں جانتے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ یہ بچے بے خبر ہیں اور بے اختیار بھی لیکن جس دن ان کو خبر اور اختیار مل گیا تو ہماری ہڈیاں اور گوشت ان کی پلیٹوں میں نظر آئے گا۔ نہ جانے وہ وقت آئے گا بھی یا نہیں۔ کاش وہ وقت جلد آجے جب میں پلیٹ میں ان بچوں کی چھریوں سے کٹتا اپنا ہڈ حرام بدن دیکھ سکوں(۱۱)۔ اس تحریر میں فن کم اور غصہ، جھنجھلاہٹ اور تلملاہٹ زیادہ نظر آتی ہے۔

رپورتاژ کے آخر میں بھی مصنف جذباتیت کا شکار ہوئے ہیں انہوں نے ہوٹل کی میزبان عرشی کی زبان سے ایک آئیڈیل پاکستانی کے جذبات بیان کیے ہیں۔ یہ اختتام بناوٹی اور مصنوعی ہو کر رہ گیا۔ اس کا اختتام کرشن چندر کی رپورتاژ "پودے" سے خاصی مماثلت رکھتا ہے۔ وہاں کرشن چندر نے اپنے ترقی پسند ہونے کا فرض نبھایا ہے تو یہاں اعوان صاحب نے ایک محب وطن پاکستانی ہونے کا فریضہ سرانجام دیا۔ رپورتاژ نگاری کا ایک اہم عنصر شخصیت نگاری یا خاکہ نگاری بھی ہے۔ ڈاکٹر بشیر سیفی خاکہ نگاری کی بنیادی خوبی بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

> "اختصار خاکہ نگاری کی بنیادی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ خاکہ نگار کو کم سے کم الفاظ میں شخصیت کے نمایاں اوصاف اجاگر کرنا ہوتے ہیں"(۱۲)

خاکہ نگاری سوانح نگاری سے ایک مختلف صنف ہے۔ سوانح نگار تو ایک مربوط سائنٹفک انداز اختیار کر کے شخصیت کو موضوع بناتا ہے جبکہ خاکہ نگار شخصیت کے تفصیلی حالات و واقعات حیات کا ذکر کرنے کے بجائے شخصیت کے بنیادی مزاج، طرز فکر اور کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال کر اُس شخصیت کا بھرپور تاثر پیش کر دیتا ہے۔ کامیاب خاکہ نگاری کے لئے زبان و بیان پر قدرت، نفسیات انسانی کا گہرا مشاہدہ، زندگی کے متنوع پہلوؤں کا وسیع مطالعہ اور کفایت لفظی بے حد ضروری ہے۔

اعوان صاحب کے خاکوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ اُن کی دوسری رپورتاژ "دھوپ، چاندی اور ہوا" میں کئی خاکے موجود ہیں لیکن اِس رپورتاژ میں چند خاکے ہی پیش کئے گئے ہیں جن میں سے افراسیاب خٹک کا خاکہ مختصر اور جامع کہا جا سکتا ہے۔ اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "افراسیات بہت نرم خو، کم گو اور بے پناہ شائستہ انسان ہیں۔ نکلتا ہوا قد، ٹھہرا ہوا جثہ، کھلی ہوئی صاف رنگت، بال پورے کے پورے، عمر جوانی کی حدود کے اندر، چہرے پر ہلکی مونچھوں کے ساتھ مستقل و مدام کھیلتی مسکراہٹ اور بھلمنساہٹ، افراسیاب بہت عالی ظرف، وسیع القلب اور انسان دوست قسم کی سوچنے اور رائے رکھنے والے انسان نظر آتے ہیں۔ شخصی اعتبار سے افراسیاب خٹک مجھے بڑے انسان دکھائی دیتے ہیں۔ نظریاتی طور پر مستحکم سیاسی توازن و اعتدال کا حامل، پورے کا پورا لفٹ سائیڈ مگر پٹھان روایات اور صوم و صلوٰۃ کا پابند۔ وہ قلم کا ایسا دھنی ہے کہ بعض اوقات ان پر رشک آتا ہے"۔(۱۳)

رپورتاژ میں دیگر لوازمات کے ساتھ اسلوب بھی خاصا اہم ہوتا ہے۔ یہی رپورٹنگ اور صحافت سے رپورتاژ کو ممیّز و ممتاز کرتا ہے۔ ہر فن کار کا اپنا سلوب ہوتا ہے جو اُس کی پہچان کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین زور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"کسی عبارت کے مطالب اور معانی اپنے مصنف کی چغلی نہیں کھاتے بلکہ اسکا اسلوب بیان پکار اُٹھتا ہے کہ میرا لکھنے والا فلاں شخص ہے۔ جس طرح کسی شخص کی آواز سنتے ہی ہم اُس کو پہچان جاتے ہیں اسی طرح کسی طرزِ بیان کے مطالعہ ہی سے ہم اس کے مصنف کو معلوم کر لیتے ہیں۔ انتخاب الفاظ، ترتیب محاورات، فقروں کی بندش، عبارت کی روانی و مد جزر لکھنے والے کی شخصیت کے وفادار ترجمان ہوتے ہیں۔ عرض یہ کہ طرزِ بیان اصولی طور پر ایک ذاتی خصوصیت ہے"۔(۱۴)

اسلوب کی اس تعریف کے بعد جب ہم مصنف کے طرزِ تحریر کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا اسلوب سادہ اور رواں ہے۔ وہ بات کو اختصار اور جامعیت سے بیان کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ وہ کوئی بھی بات بیان کرنے کے لئے صفحے کے صفحے کالے نہیں کرتے بلکہ چند نپے تلے الفاظ میں اور مختصر جملوں میں معانی کی دنیا آباد کر دیتے ہیں۔ مثلاً دنیا کے نقشے پر روس کی شکست وریخت کے بعد امریکہ واحد بڑی طاقت بن کر ابھرا اور اُس کی دھونس اور دھاندلی کی پالیسی سے ساری دنیا آگاہ ہے اور اسی کے نتیجے میں اُسے برا بھلا بھی کہا جاتا ہے اور کھلے عام کہا جاتا ہے۔ مصنف کے خیال میں امریکہ یہ سب کچھ جانتا ہے لیکن اُس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس کانفرنس میں بھی مختلف مقالات میں امریکی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی گئی لیکن امریکہ کے درجن بھر مندوبین نے ان کی کوئی پروانہ کی کیونکہ امریکی شہنشاہ اور عوام جانتے ہیں کہ یہ غلام ابن غلام لوگ چیخنے چلانے میں اپنی نجات سمجھتے ہیں تو اس کارِ خیر سے انہیں ہرگز نہ روکا جائے۔ وہ جانتے ہیں کہ زیادہ شور مچانے والوں سے کیسے نبٹا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مصنف اختصار سے کہتے ہیں:

"ہمارے ایک دوست دن میں پچاس مرتبہ امریکہ پر تبرّیٰ بھیجتے تھے اس شخص کو امریکہ والوں نے امریکہ بلوا کر سیر کروائی اور ڈالر جیب میں بھر دیئے وہ اب بھی امریکہ کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ مگر ذرا دھیمی آواز میں، جیسے مرغ کو روغن گل پلا دیا گیا ہو"۔ (۱۵)

دوسری جگہ گل جی کے رقص کی تصویر کشی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ محاکات کا لطف آجاتا ہے، لکھتے ہیں:

"ان کا رقص صوفیانہ سرور کا ایک طرفہ نمونہ تھا۔ آنکھوں میں نشہ، چہرے پر سرخوشی، بل کھاتے جاتے، جسم چراتے جاتے، بدن موڑتے، ہاتھوں کو لچ بناتے، ٹانگوں کو ٹیڑھا کر کے زمین بوس ہوتے تو کبھی دراز، پورے جسم پر رقص قولنج طاری تھا ایسا لگتا تھا گل جی عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں"۔(۱۶)

اس رپورتاژ میں طنز و مزاح کے نمونے بھی بکثرت پائے جاتے ہیں۔ بلکہ طنز کے نشتر زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ابوالخیر کشفی کے مطابق اچھا طنز نگار بے رحم جراح اور نشتر زن ہوتا ہے لیکن اس کے طنز میں انتقام اور کھوکھلا پن نہیں ہوتا وہ برے سماج کو بدلنا چاہتا ہے اُس کی بدصورتی کو مٹا کر حسن تخلیق کرنا چاہتا ہے۔(۱۷)

مصنف نے جگہ جگہ طنز و مزاح کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ کانفرنس کے ابتدائی سیشن میں سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے اور خفیہ اداروں کے افراد نے دورویہ قطاروں میں مختلف الات کی مدد سے سب کی تلاشی لی لیکن ایسے میں قومی لباس میں ملبوس لوگوں پر زیادہ توجہ دی گئی اور غیر ملکی لباس میں ملبوس لوگوں کی چیکنگ سے اجتناب کیا گیا۔ مصنف کے گہرے، کٹیلے اور زہریلے طنز کے نشتر وہاں زیادہ ہیں جہاں وہ عوام و خواص کا موازنہ اور مقابلہ کرتے ہیں یا جہاں طبقاتی نظام کے تضادات کو دکھاتے ہیں۔ طنز کے ساتھ ساتھ مزاح کا بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔ اُن کے انداز میں بے ساختگی اور برجستگی موجود ہے۔ جو قاری کو زیرِلب مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ فوکر طیارے میں اپنے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پی۔ آئی۔ اے کا فوکر طیارہ لنڈی کوتل کی ریل طرح دوڑتے دوڑتے بھی سواری بٹھالیتا ہے۔(۱۸) آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "ہمارا آثار قدیمہ جہاز بھی اپنے جہاز ہونے کا ثبوت دینے کے لئے رن وے پر کافی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ یہی مرحلہ ہوتا ہے جب کان سنسنانے لگتے ہیں اور کلیجہ منہ کو آتا ہے، خدا یاد آتا ہے، ساتھ سفید بالوں والے پائلیٹ، بالی عمر والی ائیر ہوسٹس اور آدھی سے زیادہ زندگی جہاز کی سیٹ پر گزارنے والے حکیم محمد سعید یاد آتے ہیں"۔(۱۹)

مصنف کا ایک خاص انداز مقامی زبان کے الفاظ و محاورات کا استعمال بھی ہے۔ وہ اُردو میں لکھتے لکھتے موقع کی مناسبت سے بے ساختگی اور مزاح پیدا کرنے کے لئے مقامی الفاظ بڑی مہارت سے استعمال کرتے ہیں جس سے تحریر میں جدت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو مقامی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں چنانچہ اس رپورتاژ میں پتنوس، آندھے جاؤتے لنگدے جاؤ، نظر بٹوے، جپھیاں، ہور چوپو گنے، دھکے ٹھڈے، چوندی چوندی وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ دیکھے جاسکتے ہیں۔

الغرض اس رپورتاژ میں سادہ اور رواں اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور موقع و محل کی مناسبت سے زبان استعمال کی گئی ہے۔ اس میں حقیقت نگاری کے ساتھ داخلیت اور خارجیت کے عناصر بھی موجود ہوتے ہیں۔ اور کانفرنس کے حوالے سے مقالات کے نچوڑ کے ساتھ دلچسپ واقعات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مصنف نے طنز و مزاح کے ذریعے اسے دلچسپ بنادیا ہے لیکن یہ رپورتاژ صحافتی اعتبار سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ وقت گزرے کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کم ہونے کا احتمال ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، داستان رپور تاژ نگاری، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۹ء، ص۳۸
۲) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۴۳
۳) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۵۳
۴) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۷
۵) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۲۵
۶) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۶
۷) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۶۲
۸) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۵۰
۹) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۸۲
۱۰) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۸
۱۱) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء، ص۱۵۲
۱۲) ڈاکٹر شبیر سیفی بحوالہ مضمون "خاکہ نگاری" مشمولہ خیابان اصناف نثر نمبر، ص۳۰۰
۱۳) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جہاں نما، ص۱۰۴
۱۴) ڈاکٹر محی الدین زور، اردو کے اسالیب بیان، ص۱۵۰
۱۵) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ص۸۳
۱۶) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ص۱۰۱
۱۷) ابوالخیر کشفی، ہمارے عہد کا ادب اور ادیب، ص۵۷
۱۸) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ص۱۳
۱۹) ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، جہاں نما، ص۱۴

کتابیات

۱) ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء
۲) ابوالخیر کشفی، ہمارے عہد کا ادب اور ادیب، قمر کتاب گھر کراچی، ۱۹۷۱ء
۳) انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے۔ ایچ پبلیشرز لاہور، ۱۹۹۴ء
۴) ظہور احمد اعوان ڈاکٹر، جہاں نما، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۴ء
۵) ظہور احمد اعوان ڈاکٹر، حساب دوستاں، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۵ء
۶) ظہور احمد اعوان ڈاکٹر، داستان تاریخ رپور تاژ نگاری، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۱ء

۷) ظہور احمد اعوان ڈاکٹر، دھوپ، چاندنی اور ہوا، ادارۂ علم و فن پاکستان پشاور ۱۹۹۵ء
۸) عابد علی عابد، اسلوب، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع دوم ۱۹۹۴ء
۹) سردار جعفری، ترقی پسند، ادب مکتبہ پاکستان لاہور، طبع دوم ۱۹۵۰ء
۱۰) کرشن چندر، پودے، مکتبہ سلطانی بمبئی، ۱۹۴۷ء
۱۱) محمد عالم خان، چند نئے ادبی مسائل، پاکستان بکس اینڈ لیٹریری ساؤنڈ لاہور، ۱۹۹۱ء
۱۲) محی الدین زور ادب کے اسالیب بیان، جامعہ بکڈپو دہلی، ۱۹۶۱ء
۱۳) وزیر آغا ڈاکٹر، اُردو ادب میں طنز و مزاح، جدید ناشرین لاہور، ۱۹۶۶ء

رسائل

۱۴) خیابان اصناف نثر نمبر مجلہ شعبہ اُردو جامعہ پشاور ۱۹۹۵ء
۱۵) پشاور یونیورسٹی جرنل مجلہ جامع پشاور ۱۹۹۹ جلد نمبر ۹ شمارہ ۱
۱۶) عطاء مدیر عنایت اللہ خان گنڈہ پور سہ ماہی ڈیرہ اسماعیل خان ۲۰۰۴ء